

کالا دھن، ظلم و استحصال کا نظام: احتساب و اصلاح

پروفیسر خورشید احمد

اللہ کی لاشھی بے آواز ہے۔ ظالموں کی گرفت اور پکڑ کے لیے اس کا اپنا نظام ہے۔ ڈھیل دینے کی مصلحتیں بھی اسی کی تدبیر کا حصہ ہیں، خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے بھی اس کا اپنا طریقہ ہے اور اربابِ اقتدار کو اچانک گرفت میں لینا بھی اسی کا حصہ ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ انسانی زندگی خیر و شر کی کش مکش سے عبارت ہے۔ کبھی کسی کے دن بڑے اور کبھی کسی کی راتیں بڑی ہوتی ہیں۔ لیکن جلد یا بدیر وہ وقت بھی آتا ہے جب اقتدار کے ایوانوں میں بھونچال کی سی کیفیت برپا ہو جاتی ہے، بڑی بڑی مضبوط کرسیاں ٹپکنے لگتی ہیں، ظلم و استحصال کے منبع کی حیثیت سے جو قلعے بڑے اہتمام سے تعمیر کیے گئے ہوتے ہیں اور جن کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا بڑے بڑوں کو زعم ہوتا ہے، ان میں شکاف پڑنے لگتے ہیں اور شکست و ریخت اور بگاڑ اور بناؤ کے نئے سلسلے شروع ہو جاتے ہیں۔

یہ اللہ کی سنت ہے اور تاریخ اس پر گواہ ہے: **وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ط وَاللَّهُ خَيْرٌ الْمَكْرِينَ** (انفال: ۸) ”وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے“۔ زمانے کے نشیب و فراز کا یہ الہی قانون ہے اور بالآخر اس کے ذریعے دُور رس تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، بڑے بڑے تخت اُلٹ جاتے ہیں، برج گر جاتے ہیں، جو بالا ہوتے ہیں وہ زیر ہو جاتے ہیں اور جو کمزور ہوتے ہیں وہ طاقت و رون پر غالب آ جاتے ہیں: **وَتِلْكَ الْآيَاتُ نَدَاوُلْهَا بَيْنَ النَّاسِ ج (ال عمران: ۳) ۱۴۰** ”یہ تو زمانے کے نشیب و فراز

ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔

آج پاکستان میں ملکی سطح پر نگاہ ڈالیں یا عالمی سطح پر نظر دوڑائیں تو ہر طرف تبدیلی کی لہریں موج زن نظر آ رہی ہیں۔ صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ پرانا نظام دم توڑ رہا ہے اور زمانہ نئے نظام کو دعوت دے رہا ہے۔ لیکن یہ بھی اللہ کا قانون ہے کہ بہتر تبدیلی اس وقت آتی ہے، جب افراد اور اقوام ایسے تاریخی لمحات کے موقعے پر خاموش تماشائی نہیں بنتے، بلکہ حق و انصاف کے حصول اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے صحیح خطوط پر موثر اور قرار واقعی جدوجہد کرتے ہیں، قربانیاں دیتے ہیں، اور بدی کو نیکی، خیر اور حسن سے بدلنے کے لیے سر دھڑکی بازی لگا دیتے ہیں۔

اس وقت پاکستان، عالم اسلام اور پوری دنیا مکمل تبدیلی کے ایک ایسے ہی تاریخی لمحے کے

موڑ پر کھڑی ہے۔ کیا ہم تاریخ کی پکار پر لبیک کہنے کو تیار ہیں؟

پاناما لیکس اور عالمی تغیر و تبدل

۳۱ اپریل ۲۰۱۶ء کو ایک ایسی خبر نے پوری دنیا میں ایک ہیجان برپا کر دیا، جس کے بارے میں کسی کو کوئی وہم و گمان بھی نہ تھا اور جو قدرت کا ناگہانی تازیانہ بن کر نازل ہوئی۔ جرمنی کے ایک اخبار نے 'پاناما لیکس' (Panama Leaks) کے نام سے عالمی سطح پر کالے دھن کے کاروبار، اس کی وسعت اور ستم کاریوں کے بارے میں ایک کروڑ سے زیادہ دستاویزات کا راز فاش کیا۔ اس خبر نے دنیا کے گوشے گوشے میں، مالیاتی اور سیاسی میدانوں میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ۲۰ لاکھ ۲۴ ہزار نمائشی کمپنیاں ہیں اور کم از کم ۳۲ ٹریلین ڈالر (۳۲ کھرب ڈالر) کا سرمایہ ۳۰ ٹیکس چوری کی پناہ گاہوں میں ہے جو دنیا کی کل سالانہ دولت کا ایک تہائی ہے۔ جو نمائشی کمپنیاں ہر طرح کے ٹیکس اور ریاستی نگرانی کے نظام سے بالا ہو کر اپنا کھیل کھیل رہی ہیں، انہیں پاناما میں قانون کا تحفظ حاصل ہے۔ حیرت انگیز طور پر ۱۴۶ عالمی لیڈر اس کالے کھیل میں بلا واسطہ یا بلا واسطہ ملوث ہیں، اور مزید سیکڑوں چہروں سے پردہ اٹھنے کی خبریں گردش کر رہی ہیں۔

'آف شور کمپنی' کا لفظ جو ایک محدود حلقے ہی میں پہچانا اور بولا جاتا تھا، اب زبان زد عام و خاص

ہے۔ ٹیکس سے بچاؤ کی پناہ گاہیں (Tax Havens) جو سرمایہ داروں، بڑی بڑی کارپوریشنوں اور بینکوں کی کمین گاہیں بن گئی تھیں، اب وہ پوری دنیا کے سامنے بے نقاب ہیں۔ بڑے بڑے

سیاست دانوں، تاجروں، صنعت کاروں، حتیٰ کہ ججوں اور خیراتی اداروں کو بھی کالے دھن کے تاجروں اور پچاریوں کی صف میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس انکشافی آندھی سے ابھی تو ڈیڑھ سو کے قریب عالمی شخصیات کے چہروں سے پردہ اٹھا ہے۔ یہ صرف پہلی قسط ہے، جسے سمندر میں تیرتے ہوئے برف کے پہاڑ کا محض چھوٹا سا حصہ کہا جا رہا ہے۔ بس بارش کے چند پہلے قطرے۔ موسلا دھار بارش کی پیش گوئیاں تو ۹ مئی سے بعد کے زمانے سے منسوب کی جا رہی ہیں۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

آکس لینڈ کے وزیراعظم، یوکرین کے صدر، اسپین کے وزیر صنعت و حرفت، FIFA (فیفا) فٹ بال کی بین الاقوامی اتھارٹی کے سربراہ اور نصف درجن ارباب اقتدار مستعفی ہو چکے ہیں۔ برطانیہ کے وزیراعظم ڈیوڈ کیمرن کی اخلاقی ساکھ بڑی طرح متاثر ہوئی ہے اور اپنے سارے حسابات پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنے کے باوجود، ان کا قد کاٹھ کم ہوا ہے اور وہ دفاعی پوزیشن میں آگے ہیں۔ وہ مالیات کی نگرانی کے نظام اور خصوصیت سے کارپوریٹوں اور آف شور کمپنیوں کے کردار میں بنیادی تبدیلیوں کے باب میں فوری اقدام کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

ان کے علاوہ ڈیوڈ کیمرن کے وزیر خزانہ، پارلیمنٹ میں لیڈر آف دی اپوزیشن اور متعدد اہم شخصیات نے اپنی آمدنی، ٹیکس اداگی کی تفصیلات اور ذاتی مالی صورت حال، تحریری شکل میں، رضا کارانہ طور پر پارلیمنٹ اور عوام کے سامنے پیش کر دی ہے۔ اس طرح انھوں نے بجا طور پر ثابت کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو جواب دہی سے بالاتر نہیں سمجھ رہے۔ یہاں پر یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ جمہوریت کی جو بھی خوبیاں اور خامیاں ہوں، ان میں سب سے اہم چیز قیادت کی اخلاقی ساکھ ہوتی ہے۔ سر آئیور ہنگو کی کتاب Cabinet Government (کیسبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۹ء) علم سیاسیات میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ: جمہوریت میں اصل چیز قیادت کی اخلاقی ساکھ ہے۔ اگر اس پر حرف آجائے تو پھر حکمرانی کا جواز باقی نہیں رہتا۔ ہمارے دستور میں بھی ایک دفعہ سیاسی قیادت کے صادق اور امین ہونے کے بارے میں ہے۔ لیکن افسوس کہ اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھنے والوں کو اپنے دستور کا یہ حصہ یاد رکھنے کی فرصت ہی نہیں!

یورپ کے پانچ ممالک اور دنیا کے ۳۰ سے زیادہ ممالک کے نظام احتساب و اصلاح میں

تبدیلیوں کا آغاز ہو گیا ہے۔ آف شور کمپنیوں کو قانون کی گرفت میں لانے اور کالے دھن کو قابو میں کرنے کی بات اب سرفہرست آگئی ہے۔ ایک طرف احتساب کا عمل ہے، جو حرکت میں آرہا ہے، تو دوسری طرف کالے دھن کا پورا تصور، ٹیکس سے چھوٹ کے مراکز (Tax Haven) کا وجود، اس سلسلے کے قانونی، سیاسی اور اخلاقی پہلوؤں پر سوچ بچار اور مالی معاملات میں شفافیت (transparency) کی ضرورت کو وقت کے اہم ترین مسئلے کے طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے۔ ہزاروں افراد اور اداروں سے جواب طلبی ہو رہی ہے۔ دنیا کے پورے مالی دروبست اور ٹیکس کے نظام پر بنیادی نظر ثانی کی ضرورت کو اجاگر کیا جا رہا ہے۔ یہ کوئی معمولی تبدیلی نہیں۔ ایک شر سے بہت سے خیر کے رُومنا ہونے کے امکانات بڑھ رہے ہیں، حتیٰ کہ امریکا جس کی نصف درجن ریاستیں ٹیکس سے چھوٹ کے مراکز کا درجہ رکھتی ہیں اور جس کے نتیجے میں وہ دنیا کے ان ۳۰ ممالک میں، جو ٹیکس چوری کی پناہ گاہ ہیں اور تیسرے نمبر پر ہے (یعنی پاناما سے بھی اوپر ہے) اس کے صدر بارک اوباما کو کہنا پڑا ہے کہ:

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ عالمی سطح پر ٹیکس کی ادائیگی سے بچنا ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ہمیں اسے اس لیے قانونی نہیں بنانا چاہیے کہ محض ٹیکسوں کی ادائیگی سے بچنے کے لیے رقوم کی منتقلی (transactions) میں مصروف ہوا جائے، جب کہ اس پر زور دیا جانا چاہیے کہ اسے یقینی بنانے کی ضرورت ہے کہ ہر شخص ٹیکس کے سلسلے میں اپنا مناسب حصہ ادا کرے۔ (دی گارڈین، ۱۵ اپریل ۲۰۱۶ء)

امریکی اٹارنی برائے مین ہٹین، مسٹر پریٹ بھارے نے امریکا کی ان تمام کمپنیوں، جن کا نام موجودہ فہرست میں آیا ہے اور جن کی تعداد ۲۰۰ ہے، ان کے بارے میں کہا ہے کہ ان ۲۰۰ کمپنیوں کے بارے میں باقاعدہ تفتیش اور تحقیقات کا آغاز کیا جا رہا ہے (واضح رہے کہ پاکستانی میڈیا پر کہا جا رہا ہے کہ ”امریکا کی کوئی کمپنی اس فہرست میں شامل نہیں“، یہ درست بات نہیں ہے)۔ (دیکھیے: دی انڈی پنڈنٹ، لندن، ۲۰ اپریل ۲۰۱۶ء)

کالا دھن : کرپشن کمی مکروہ شکل

بلاشبہ پاکستان کی بڑی سیاسی قیادت، کاروباری شخصیات، حتیٰ کہ ایک سابق اور ایک

موجودہ جج تک آف شور کمپنیوں کے اس انکشاف کی زد میں ہیں اور یہ ایک بڑا اہم مسئلہ ہے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ پورے مسئلے کو اس کے عالمی تناظر میں دیکھا جائے اور وہ راستہ اختیار کیا جائے، جس کے نتیجے میں ایک طرف کالے دھن کا کاروبار کرنے والے افراد اور اداروں پر ریاست کی اور عالمی احتسابی نظام کی بھرپور گرفت ہو سکے، تو دوسری طرف ظلم اور استحصال کے اس نظام کا ملک ہی نہیں بین الاقوامی سطح پر قلع قمع کیا جاسکے، جس کی وجہ سے کرپشن، معاشی دہشت گردی اور لوٹ مار کی لعنت نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں مفاد پرستی، نفع اندوزی، دولت کی شرم ناک عدم مساوات (obscene inequalities) اور انسانوں کے بڑے طبقے کی محرومیاں زندگی کی تلخ حقیقت بن گئی ہیں۔

’کالا دھن‘ کرپشن کی ایک ملعون شکل ہے اور اس سے مراد خصوصاً وہ دولت ہے، جو جائز طریقے سے حاصل نہ کی گئی ہو۔ رشوت، کمیشن اور ایسی ہی دوسری قبیح حرکتوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والی دولت کے ساتھ وہ دولت بھی، جو چاہے جائز طریقے سے کمائی گئی ہو لیکن اگر اس کو ریاست کے ٹیکس کے نیٹ ورک سے باہر رکھا گیا ہو، تو وہ ’کالے دھن‘ میں شمار ہوتی ہے۔

اسی طرح اگر ایک ہی کمپنی اپنی ذیلی کمپنیوں کی مدد سے اشیائے تجارت کی قیمتوں میں کمی اور اضافے کے ذریعے اخراجات کو مصنوعی طور پر بڑھانے اور دکھائے جانے والے منافع کو کم کرنے کے لیے ہاتھ کی صفائی کا مظاہرہ کرے، تو یہ بھی کالے دھن ہی کی ایک صورت ہے۔

اگر یہ کھیل قانون کی کھلی کھلی خلاف ورزی کر کے انجام دیا جائے، تو اسے ’فرار محاصل‘ یا فرار ٹیکس (Tax Evasion) کہتے ہیں اور اگر اس حوالے سے قانون کے کسی سقم سے راستہ نکالا جائے تو اسے ’اجتناب ٹیکس‘ (Tax Avoidance) کہتے ہیں۔ آف شور کمپنیوں کے ذریعے دونوں ہی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ نیز آمدنی اور اس کے اصل ذرائع کو مخفی (secret) رکھا جاتا ہے، اور حسابات اور مالی معاملات کو اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ اصل نفع راز بھی رہے اور ٹیکس کی مشینری کی گرفت میں بھی نہ آئے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ کھلے کھلے دھوکے کا ایک ’خوش نما‘ نام ہے اور ہاتھ کی صفائی کی جادوگری ہے۔ قانون کو ہوشیاری سے توڑا جائے یا قانون کو بھونڈے طریقے سے توڑا جائے، اخلاقی طور پر دونوں قبیح فعل ہیں اور اپنی روح کے اعتبار سے

جرائم ہیں۔ اس لیے قانون کے باب میں کہا جاتا ہے کہ اس کی پاس داری لفظی اور معنوی اعتبار سے (in letter and spirit) کی جانی چاہیے۔

دین اسلام پر مبنی قوانین کا یہ امتیاز ہے کہ وہ اخلاق اور ایک حتمی اور بالاتر اتھارٹی کے حکم پر مبنی ہونے کی وجہ سے ایمان کا حصہ ہوتے ہیں اور ان کی اطاعت محض قانون کی خانہ پُری کے لیے نہیں ہوتی، بلکہ حق و انصاف کے قیام اور اللہ کی اطاعت، اور اس کی رضا کے حصول کے جذبے سے ہوتی ہے۔ یہی وہ صورت ہے جس میں قانون اپنی تمام برکات اور اپنے تمام ثمرات سے فرد اور معاشرے کو فیض یاب کر سکتا ہے۔ اللہ اور خلق، دونوں کے سامنے بیک وقت جواب دہی اور اس جذبے کے ساتھ قانون، اس کے الفاظ اور روح کے ساتھ پاس داری میں معاشرے کی مضبوطی اور خوش حالی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو اپنی وسعت اور ہمہ گیریت سے الہی اصول، اور قانون فراہم کرتی ہے۔ یہی وہ بنیادیں ہیں جو اسلامی قانون اور شریعت کو انسانوں کے درمیان عدل و انصاف کا حقیقی ضامن بناتی ہیں۔ جب مذہبی خاندان ہونے کے دعوے دار فرار (evasion) اور اجتناب (avoidance) کی بات کرتے ہوں تو اس پر تعجب نہ ہو تو اور کیا ہو۔

یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے، جب جیل میں میں حضرت مولانا معین الدین خٹک مرحوم [مارچ ۱۹۲۰ء - ۲۷ جولائی ۱۹۸۲ء] سے اصول فقہ پڑھ رہا تھا، تو باب الجیل کی تدریس کے دوران زکوٰۃ کے بارے میں ایک بات انھوں نے ایسی کہی، جو ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہوگئی۔ زکوٰۃ اس مال پر واجب ہوتی ہے، جو ایک سال تک ایک فرد کی ملکیت میں رہا ہو۔ مولانا خٹک مرحوم نے فرمایا کہ: ایسے لوگ بھی ہیں جو ۱۰ ماہ کے بعد اپنی دولت، اپنی بیوی یا کسی رشتے دار کو ہبہ کر دیتے ہیں اور اگلے ۱۰ ماہ کے بعد وہ رشتہ دار اولین مالک کو ہبہ کر دیتا ہے اور اس طرح دونوں زکوٰۃ سے بچ جاتے ہیں۔ یہ ہے وہ اجتناب کی حیلہ بازی (avoidance) جس کا کریڈٹ لیا جا رہا ہے، حالانکہ حقیقت وہی ہے جس کی طرف مولانا معین الدین خٹک نے متوجہ فرمایا، یعنی:

يُخَدَعُونََ اللّٰهَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۝
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَرَادُوْهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (البقرہ ۲: ۹-۱۰) وہ اللہ اور ایمان
لانے والوں کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں، مگر دراصل وہ خود اپنے آپ ہی کو

دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے، جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا۔

ٹیکس بچانے کی کمین گاہوں اور آف شور کمپنیوں کا پورا نظام: ریاست، قانون کے نظام، معاشرے، انسانیت بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکا دینے کی ایک منظم (بظاہر قانون کی چھتری کے تحت) کوشش سمجھا اور بیان کیا جاتا ہے، جو دراصل سرمایہ دارانہ نظام کی چال بازی کے سوا کچھ نہیں۔ گذشتہ ۱۰۰ سال کے تجربے کے بعد اب اس کے نظام ظلم و استحصال ہونے کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ عوامی ردعمل کے نتیجے میں اسے ختم کیا جائے گا یا پھر کم از کم اس پہلے مرحلے میں اس کی حشر سامانی کو بڑی حد تک محدود کیا جائے گا۔

۲۰ ویں صدی کے آغاز میں انکم ٹیکس اور کاروباری ٹیکس کا آغاز ہوا، اور اس کے بعد ہی سے بنکاری نظام میں رازداری کے نام پر ٹیکس چوری کی کمین گاہوں کا قیام، نمائشی اور ذیلی کمپنیوں کا وجود، اور ان کے ذریعے نفع کو لاگت کا لبادہ اوڑھا کر کالے دھن کے کاروبار کو آسمان پر پہنچا دیا گیا۔ ابتدا میں پٹرول اور گیس کی کمپنیوں اور ٹرانسپورٹ اور بحری جہاز رانی کے شعبے، اس میدان میں بہت آگے تھے، پھر پوری ہی کاروباری دنیا نے اس نظام کو اپنا اوڑھنا چھوٹا بنا لیا۔ اب یہ اندازہ ہے کہ دنیا کی تجارت کا تقریباً ۴۰ فی صد اس کالے دھندے کے سہارے انجام پذیر ہو رہا ہے۔

(ملاحظہ ہو Panama and The Criminalization of the Global Finance: System)

از Sharmine Peries and Michael Hudson، کاؤنٹر پینچ، ۱۸ اپریل ۲۰۱۶ء)۔
اس طرح ۳۳ ٹریلین ڈالر سے زیادہ رقم صرف ان ۳۰ ٹیکس چوری کی پناہ گاہوں میں ہے۔ جہاں تک ترقی پذیر ممالک کا تعلق ہے، ان کی دولت کا بھی بڑا حصہ انھی پناہ گاہوں کی زینت ہے۔

ورلڈ بینک کے ایک اندازے کے مطابق ۲۰۰۷ء سے ۲۰۱۳ء تک ۸۷ ٹریلین ڈالر غریب ممالک سے ان مالیاتی کمین گاہوں میں منتقل ہوئے ہیں، جو تین یورپی ممالک جرمنی، فرانس اور اٹلی کی مجموعی قومی آمدنی سے زیادہ ہے۔ اس وقت ان مراکز میں سالانہ ایک ٹریلین ڈالر منتقل ہو رہے ہیں اور اس میں سالانہ اضافے کا اندازہ ۶.۵ ہے، جو عالمی سطح پر معاشی ترقی کی رفتار میں اضافے سے دوگنا ہے۔ اس طرح منتقل ہونے والے سرمایے کی وجہ سے صرف ٹیکس کی مد میں جو

نقصان ترقی پذیر ممالک کو ہو رہا ہے، وہ سالانہ ۱۰۰ ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ اگر صرف یہ رقم ترقی پذیر ممالک کے پاس ہو اور کل سرمایہ انہی میں دوبارہ گردش میں آجائے تو ۱۰ سال میں ان تمام ممالک سے غربت اور جہالت کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور صحت و صفائی اور مناسب سماجی زندگی میں بھی نمایاں ترقی ہو سکتی ہے۔ ایک طرف ان ممالک کی دولت امیر ملکوں کی طرف منتقل ہو رہی ہے اور دوسری طرف غریب ممالک، امیر ممالک کے قرضے کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں اور مالیاتی اور معاشی غلامی کے نئے شکنجوں میں گرفتار ہو رہے ہیں۔ بد قسمتی سے غلامی کے اس نئے دور کو مسلط کرنے میں ان کے اپنے سیاسی قائدین اور کاروباری طبقوں کا بڑا ہاتھ ہے۔

عالمی ردعمل

’پاناما لیکس‘ کے نتیجے میں جتنے ممالک کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، اور کیت اور کیفیت ہر دو کے سلسلے میں جو وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے اس کے ایک طرف یورپ اور امریکا کی قیادتیں ہیں، جن کے ساتھ مشرقی ممالک کی قیادت کو بھی مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا ہے، تو دوسری طرف عوامی سطح پر اس نے عام لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ استعجاب اور غصے کے بعد اب جو ردعمل ظہور پذیر ہوا ہے، وہ غلامی اور استحصال کے اس نظام کے خلاف بغاوت اور اس سے نجات کی جدوجہد کا ہے۔ اگر اس پہلو سے جان دار ردعمل رونما ہو سکے تو اس شر سے بہت خیر کے رونما ہونے کا امکان ہے۔ اس وقت کیا احساسات کروٹ لے رہے ہیں، اس کا تھوڑا سا اندازہ مندرجہ ذیل آرا سے کیا جاسکتا ہے، جو اس وقت کے عوامی ردعمل اور ہوا کے رخ کی نشان دہی کر رہے ہیں۔

انٹرنیشنل نیویارک ٹائمز A Global Web of Corruption کے زیر عنوان

ادارتی مقالے (۷/۷ اپریل ۲۰۱۶ء) میں بیان کرتا ہے:

سامنے آنے والی ان دستاویزات پر جنہیں ’پاناما دستاویزات‘ کا نام دیا گیا ہے، پہلا ردعمل حیرت زدگی کا ہے، اس دستاویزی ذخیرے کے پھیلاؤ اور حجم پر اور اس گم نام ذریعے کی غیر معمولی ہنرمندی پر، جس نے ایک کروڑ ۵ لاکھ دستاویزات یعنی ۲۶۶ ٹیرابائٹس کے غیر معمولی انکشافات پریس کے سامنے لائے، کس طرح آف شور

بنک اکاؤنٹ اور ٹیکس پناہ گاہیں دنیا کے امیر اور طاقت ور افراد اپنی دولت چھپانے یا ٹیکس بچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا عمل نفرت اور کراہت کا ہے۔ پوری دنیا میں ۱۴ ہزار سے زیادہ گاہک اور ۲ لاکھ ۱۴ ہزار ۵ سو سے زیادہ آف شور عناصر نے پاناما کی Mossack Fonseca کمپنی، کوجس کی خفیہ دستاویزات ظاہر ہوئی تھیں، شریک جرم کیا۔ یہ معصومیت سے اصرار کرتی ہے کہ اس نے کسی قانون یا اخلاقیات کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔

لیکن یہ تمام سوالات تشہرہ جاتے ہیں: کس طرح یہ سب سیاست دان، آمر، مجرم، ارب پتی اور مشہور شخصیات بہت زیادہ دولت جمع کرتے ہیں اور پھر کس طرح ان شیل کمپنیوں کے پیچیدہ جال سے فائدہ اٹھاتے ہیں، تاکہ اپنی دولت کو چھپائیں؟

پھر سب سے بڑا اور مرکزی سوال یہ بھی ہے کہ کیا انکشافات کے بعد کوئی چیز تبدیل بھی ہوگی؟ بہت سی رسمی تردیدیں بھی کی گئی ہیں اور سرکاری تحقیقات کے وعدے بھی کیے گئے ہیں، لیکن قانون اور عوام کے سامنے شرمندگی کو اس عالمی اعلیٰ طبقے پر کس حد تک برتری حاصل ہوگی؟ وہ عوام جو حکومتی سطح پر مالیات میں کرپشن کے بار بار انکشافات سے پہلے ہی گھبرائے ہوئے ہیں، وہ حقیقت جاننے کا مطالبہ کریں گے۔

ان دستاویزات میں ایک ایسی عالمی صنعت کو تاریخی طور پر ترتیب وار جمع کیا گیا ہے، جس نے ایک بین الاقوامی اشرافیہ کو کرپٹ اور غیر قانونی ذرائع سے مالا مال کیا ہے، تاکہ اپنی دولت اور اس کاروبار کو ٹیکسوں، مقدمات اور عوامی غیظ و غضب سے چھپائیں۔

یہ دستاویزات اس مہلک دولت کا انکشاف کرتی ہیں جسے سرکاری ملازمین نے چھپایا ہے۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ پاناما دستاویزات ایک ایسی صنعت کا انکشاف کرتی ہیں جو

بین الاقوامی مالیات کی دراڑوں اور خفیہ راستوں میں پھلتی پھولتی ہے۔ اس نظام کا ایک

نتیجہ ٹیکس آمدنی کا وہ حصہ ہے جو وصول نہ ہو سکا۔ اس سے زیادہ خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ

یہ جمہوری حکومت اور علاقائی استحکام کو شدید نقصان پہنچاتی ہے کیوں کہ بدعنوان

سیاست دانوں کے پاس، ایک ایسی جگہ ہوتی ہے، جہاں وہ چوری کیے ہوئے اثاثوں کو عوام کی نظروں سے بچا کر خفیہ جگہ پر رکھتے ہیں۔

لندن کے اخبار دی آبزورر (The Observer، ۱۰/۱۱/۲۰۱۶ء) نے ادارتی نوٹ میں برطانیہ اور اس کے وزیر اعظم کے حوالے سے بات کہی ہے، لیکن اس کا پیغام بھی عالم گیر ہے: 'پاناما دستاویزات' کے جو حصے سامنے آئے ہیں اور ان میں جو انکشافات کیے گئے ہیں، وہ پوری دنیا کے رہنماؤں، حکومتوں اور تجارتوں کے لیے سنجیدہ مضمرات رکھتے ہیں۔ اب، جیسا کہ دستاویزات بتاتی ہیں کہ یہ مغربی حکومتیں ہیں، جو ایک ایسے عالمی مالیاتی نظام کو برداشت کرتی اور سہولت دیتی ہیں، جو موقع پرستانہ اور عموماً غیر قانونی، استحصالی، ایک نجی ملکیت میں کام کرنے والا ہو اور جس کا انتظام و انصرام بڑی حد تک خفیہ ہو، جو خود مختار کنٹرول کے بغیر، نیز ایک منظور شدہ قواعد کی کتاب اور موثر قواعد و ضوابط کے بغیر کام کرتا ہو۔ اب جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک ایسی بااختیار تنظیم ہے، جس کی نگرانی اقوام متحدہ کرتی ہو۔

پروفیسر ہل گورٹو و جو پورٹ لینڈ اسٹیٹ یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر ہیں، اپنے ایک مضمون مطبوعہ کاؤنٹر پنچ (Counterpunch، ۱۸/۱۱/۲۰۱۶ء) میں لکھتے ہیں:

کثیر قومی کارپوریشنوں کے کاروباری انتظام کے بہت سے طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک منافع کو زیادہ سے زیادہ کرنے اور ریاست کی خود مختاری کو غیر مستحکم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کم ٹیکس والے ممالک کو منتقل ہو جائیں۔ بہت زیادہ دولت مند افراد کے ٹیکس سے فرار کے نتیجے میں غریبوں پر ٹیکس زیادہ ہو جاتا ہے۔

ایک یورپی مفکر، جس نے یورپ اور امریکا میں تدریس اور تحقیق کے طویل عرصے تک فرائض انجام دیے ہیں، اس نے اس پورے مسئلے پر الجزیرہ ٹیلی ویژن (۶/۱۱/۲۰۱۶ء) پر اپنی ایک تقریر Panama Papers: Why should we care? کے دوران بڑی پتے کی بات کہی ہے:

ایک ایسی دنیا میں جس میں عدم مساوات انتہا کو چھوتی ہو اور سماجی مسائل بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے ہوں، جیسا کہ ہماری دنیا ہے، ٹیکس پناہ گاہوں کے وجود سے ٹیکس سے

بچنے کے معاشی، سماجی اور سیاسی طریقے بے پناہ ہیں۔ ایسے میں وہ معاشرے جو ٹیکسوں کے بغیر ضروری معیار پر کام کے لیے کوشش کر رہے ہوں گے، ناگزیر سماجی سہولیات کی فراہمی میں ناکام رہیں گے۔

لیکن جب مزدور اور اوسط درجے کے تاجر پوری شرح پر ٹیکس ادا کر رہے ہوں، جب کہ عالمی معیشت کی ساتھ ساتھ بڑھوتری اور آف شور پناہ گاہوں کے پھیلنے کی وجہ سے عالمی کارپوریٹوں اور غیر معمولی دولت مند برسہا برس سے کم سے کم ٹیکس ادا کر رہے ہوں۔ تو پھر عالمی سرمایہ داری، ٹیکسوں کی ناانصافی اور جمہوریت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کو خوش آمدید کہیے!

آخری بات یہ ہے کہ پاناما دستاویزات نے جس چیز کا انکشاف کیا ہے، وہ یہ ہے کہ صرف عالمی ٹیکس کا نظام نہیں بلکہ بذات خود عالمی طرز حکمرانی ٹوٹ گیا ہے۔ اب آخری چیلنج یہ ہے کہ عالمی سرمایہ داری نظام کو بذات خود تبدیل کیا جائے۔ (الجزیرہ، ٹیلی ویژن نیٹ ورک، ۶ اپریل ۲۰۱۶ء)

اخلاقی اور نظریاتی پہلو

پاناما دستاویزات پر جو ردعمل پاکستان میں سامنے آیا ہے اور جن امور پر بحث ہو رہی ہے، ان پر بھی ہم کلام کریں گے، لیکن جو دو پہلو بد قسمتی سے اس بحث و مباحثے میں تقریباً مفقود ہیں، وہ اخلاقی، نظریاتی اور عالمی سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی تباہ کاریوں کا حوالہ ہے، اور جس میں فتنے کی اصل جڑیں ہیں۔

دولت کا ایک وہ تصور ہے جو حرام اور حلال اور انصاف اور ظلم اور دولت کی پیدائش، وسائل کی ترقی اور انسانی معاشرے کی خوش حالی اور تہذیب و ثقافت کی آبیاری سے متعلق ہے۔ یہ زیر بحث ہی نہیں آ رہا۔ بلاشبہ افراد کی کرپشن اہم ہے اور اس کے نتائج ملک و معاشرے کے لیے تباہ کن ہیں۔ اس پر مؤثر گرفت بھی ہونی چاہیے کہ یہ انصاف کا تقاضا ہے اور ترقی اور خوش حالی کے لیے ضروری شرط ہے۔ لیکن کالے دھن کے اس کاروبار میں اخلاق، قانون، معاشرے، سرمایے اور دولت کے رشتے کو جس طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے، وہ بحث کو یک رخا بنا دیتا ہے۔

اس لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ پاکستان کو درپیش مسئلے کو، اس کے تاریخی اور عالمی معاشی نظام کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کی روشنی میں مسئلے کا حل تلاش کرنے کی بھی کوشش کریں۔ ہماری نگاہ میں اس کے تین پہلوؤں کو (جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں) سمجھنا، ان کے اسباب کا تعین اور حالات کی اصلاح کے لیے ملکی اور عالمی سطح پر تبدیلی کا نقشہ کار مرتب کرنا اصل ضرورت ہے۔

کالے دھن کی لعنت، دولت کے بارے میں غلط تصور، صرف مادی ترقی اور ذاتی اور خاندانی ثروت کی تنگ و دو، حرام و حلال اور جائز و ناجائز سے بے پروا ہو کر دولت کی افزائش کا لالچ اور طمع، حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں سے انماض اور صرف ذاتی غرض اور طمع کا اسیر بن جانا سارے بگاڑ کی بنیاد ہے اور کالا دھن اسی ذہن اور اسی روش کی پیداوار ہے۔

جو دین اسلام یہ حکم دیتا ہو کہ: ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ، دولت پیدا کرو، مگر اس لیے کہ اللہ کی راہ میں انفاق کرو، دعوت اور جہاد کی ضرورتوں کو پورا کرو، معاشرے اور ریاست کی خدمت کرو، ضرورت مندوں اور مجبوروں کو اُد پر اُٹھانے کے لیے وسائل کو بلا تامل استعمال کرو۔ پھر جو دین یہ بھی دل و دماغ میں محکم کرتا ہو کہ: جو اب دہی صرف ظاہری طور پر قانون اور معاشرے کے سامنے نہیں، سب سے بڑھ کر اللہ کے سامنے ہے اور ہم میں سے ہر فرد کو پائی پائی کا حساب دینا ہوگا کہ کہاں سے اور کیسے کمایا تھا اور کہاں اور کیسے خرچ کیا تھا؟ تو پھر پوری معاشی زندگی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔

اگر ہمارے دعوے 'مذہبی پس منظر کے حامل خاندان' کے سے ہیں اور ہمارا ذہن اور رویہ خالص مادہ پرستانہ اور سرمایہ دارانہ فکرو اخلاق ہی پر استوار ہے، تو سمجھ لینا چاہیے کہ دین پرستی اور مادہ پرستی دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ مسئلے کو اس کے اصل تناظر میں سمجھنے کے لیے اس اخلاقی اور نظریاتی پہلو کو بالکل شروع ہی میں واضح کر دیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ کالے دھن، نیکیس چوری، کرپشن سے حاصل کردہ دولت، نیکیس چوری کی پناہ گاہوں میں چھپنے کا کھیل۔۔۔ اسے مغربی تہذیب اور سرمایہ دارانہ نظام کے اس پس منظر میں قارئین کے سامنے رکھیں، جس میں یہ سارا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور اس میں اپنے اور غیر سب برابر

کے شریک ہیں۔ جن ۱۲ سربراہان مملکت کا نام لے کر ان کے یا ان کی اولاد کے یا قریبی عزیزوں کے ملوث ہونے کا ذکر ان دستاویزات میں آیا ہے، ان میں سے چھ، یعنی ۵۰ فی صد مسلمان ہیں، فَاَعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ۔

کرپشن کے خلاف مغربی قیادتیں اظہار بیان کا لمبا چوڑا ریکارڈ رکھتی ہیں۔ لیکن ان کا قانون، ان کی پالیسیاں، ان کے بنائے ہوئے انتظامات ہی وہ فضا اور میدان فراہم کر رہے ہیں، جس میں یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ سوئٹزرلینڈ جو یورپ کا مالیاتی دارالحکومت ہے اور ہانگ کانگ جو ایشیا کا سوئٹزرلینڈ ہے، اس کے بعد امریکا اس وقت ٹیکس چوری کی پناہ گاہوں میں نمایاں ترین مقام رکھتا ہے۔ خصوصیت سے اس کی چھ ریاستیں جو 'فریکس' کی پناہ گاہوں کا درجہ رکھتی ہیں، اس سارے کھیل کی آماج گاہ ہیں۔ برطانیہ کے جزائر تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ ٹیکس چوروں کی پناہ گاہیں بنے ہوئے ہیں اور ان سب کو ایک طرح کا قانونی تحفظ حاصل ہے۔

گذشتہ ۱۰۰ سال سے یورپ کے بیش تر ممالک میں ترقی پذیر ممالک میں سرمایہ کاری اور تجارت دونوں کے سلسلے میں رشوت دے کر کاروبار حاصل کرنا، ایک جائز اور قانونی فعل تھا، اور اسے باقاعدہ حسابات میں ضروری اخراجات کے طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ تبدیلی صرف گذشتہ ۲۰۱۵ سال میں آئی ہے کہ اس کھلی کھلی مالی بدعنوانی کے لیے قانونی جواز کو ختم کیا گیا ہے۔ اگرچہ عملاً یہ کھیل اب بھی جاری ہے اور ٹرانسپیرینسی انٹرنیشنل کی ۲۰۰۴ء کی رپورٹ کے مطابق چند یورپی ممالک میں اب بھی کاروبار کے فروغ کے لیے اور خصوصیت سے اسلحہ کی فروخت اور میگا پراجیکٹس کے سلسلے میں، اپنے ملک سے باہر رشوت اور کمیشن کی جادوگری کوئی قانونی جرم نہیں ہے۔

آج کے دور میں کالے دھن کی ریل پیل کو سمجھنے کے لیے یہ پس منظر جاننا ضروری ہے اور اس کا جو تزویری تعلق نظام سرمایہ داری، اس کی بنیادی اقدار اور نظام کار سے ہے، اس کو سمجھنا، از حد ضروری ہے۔ اسی پس منظر میں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر ملک میں آپ سرمایہ دارانہ نظام کو فروغ دیں گے تو ان تمام بُرائیوں اور تباہ کاریوں سے بھی بچ نہیں سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری نگاہ میں موضوع زیر بحث کے تین پہلو ہیں، یعنی:

۱- کالا دھن، ان کی کیت، کیفیت، تباہ کاریاں۔ ان کا ادراک اور لعنت سے نجات کی کوشش۔

۲- وہ نظام ظلم اور استحصال جو اس لعنت کو پیدا کرتا، پروان چڑھاتا اور معتبر بناتا ہے، بلکہ مذہبی پس منظر کے دعوے دار بھی کھلے بندوں اس سے فیض پانے کا اعلان کرتے ہیں۔ 'فرار ٹیکس' (Tax evasion) خلاف قانون ہو سکتا ہے، لیکن 'اجتناب ٹیکس' (Tax avoidance) تو ہمارا حق ہے اور اس کے لیے جہاں بھی جانا پڑے، ہمارا پیدا ہونے کا حق ہے۔

۳- تیسرا پہلو حالات کی اصلاح کا ہے اور پھر اس کے بھی دو پہلو ہیں: یعنی احتساب اور غلط کام پر اصول انصاف اور قانون کے مطابق مضبوط اور موثر گرفت اور نظام، اور اس سے بھی بڑھ کر اس ذہن و فکر اور طرز زندگی کی اصلاح، تاکہ ظلم اور استحصال کے نظام سے بچا جاسکے۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنی صحت کی خرابی کے باعث اس اہم موضوع سے متعلق قرار واقعی معلومات پیش نہیں کر سکا اور اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی تو آئندہ اپنی گزارشات پیش کروں گا۔ اس وقت صرف چند ضروری نکات کی نشان دہی کرتا ہوں، اور ملک کی قیادت اور خصوصیت سے اسلامی قوتوں کو ان پر غور کرنے اور ان کی روشنی میں اپنی پالیسی اور حکمت عملی طے کرنے کی دعوت دیتا ہوں۔

مسئلے کا حل اور مجوزہ اقدامات

۱- پہلی بات یہ ہے کہ پاناما دستاویزات میں جو نام آئے ہیں اور جو مزید آئیں گے، ان سب کے بارے میں ایک واضح پالیسی اور طے شدہ قاعدے کے مطابق کارروائی ہونی چاہیے۔ اس کے لیے اس وقت ملک میں اور دنیا میں جو قانونی پوزیشن ہے، اس کی روشنی میں یہ کارروائی ہونی چاہیے۔ شاید اس کے لیے مناسب ترین انتظام یہ ہو کہ ملک میں حکومت، تمام اپوزیشن جماعتوں، عدلیہ اور سول سوسائٹی اور اچھی شہرت رکھنے والے سابق سول بیورو کریسی اور اعلیٰ فوجی افسران کے مشورے سے قومی احتساب کا ایک آزاد، بااختیار اور قابل اعتماد ادارہ بنایا جائے اور اسے تفتیش اور قانونی گرفت (Prosecution) کے پورے اختیارات دیے جائیں، ضروری وسائل فراہم کیے جائیں اور تربیت کا نظام بنایا جائے۔ نیز اس کے اندر بھی احتساب و توازن (check & balance) کا اہتمام کیا جائے اور متعین وقت کے اندر اسے زیر غور معاملات کو طے کرنے کا پابند کیا جائے۔

اس کی رپورٹ پارلیمنٹ اور سپریم کورٹ میں پیش ہو، اور اس پر پارلیمنٹ اور میڈیا میں کھل کر بحث کی جائے، تاکہ یہ ادارہ فی الحقیقت موثر انداز میں کام کرے اور محض باہمی مالیاتی

سودے بازی (Plea bargaining) کا اکھاڑہ نہ بن جائے۔ یہاں پر مثال کے طور پر یہ امر مدنظر رہے کہ بھارت نے ۲۰۱۳ء میں بیرونی ممالک میں بھارت کے کالے دھن پر گرفت کا قانون بنایا اور احتساب کا نظام قائم کیا۔ اب تک اس کی دور پورٹیں آچکی ہیں اور گذشتہ دو سال میں، ٹیکس سے بچ جانے والے سرمایے سے ٹیکس کی مد میں ۶۱ ارب ڈالر سے زیادہ واجبات وصول کیے جا چکے ہیں۔ اگر بھارت میں یہ ہو سکتا ہے تو ہمارے ہاں اس کی راہ میں کیا چیز رکاوٹ ہے؟

۲۔ موجودہ خصوصی صورت حال کے پیش نظر جوڈیشل کمیشن بھی ایک مناسب حل ہے۔ ضرورت ہے کہ بحث کو صرف ٹی وی اور گلیوں میں کرنے کے بجائے باعنی مذاکرات کے ذریعے معاملات کو طے کیا جائے۔ جوڈیشل کمیشن کو اعلیٰ عدلیہ کے ججوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ لیکن اس کے تحت اسی کے فیصلے سے تفتیشی ٹیم مقرر ہونی چاہیے جو ایسے معتبر اور تجربہ کار افراد پر مشتمل ہو، جو متعلقہ امور کے بارے میں انصاف کے ساتھ تفتیش کر سکیں یا کر سکیں اور عدالتی کمیشن کی صحیح معاونت کر سکیں۔

اس کمیشن کو اپنا کام ایک متعین مدت میں ختم کر دینا چاہیے اور پھر اس کے کام اور تفتیشی ٹیم کی سفارشات کی روشنی میں اوپر جس احتساب کمیشن کا مشورہ دیا گیا ہے، وہ کام کو جاری رکھے۔

مجوزہ کمیشن کام کا آغاز موجودہ حکومت کے ان تمام افراد کے بارے میں تحقیق و تفتیش سے کرے، جن کا نام 'پاناما دستاویزات' میں آیا ہے اور یہ ۱۹۸۶ء سے اب تک کے عرصے کو اپنے دائرہ بحث میں لائے۔ لیکن اس کے بعد اس کمیشن کو دو مزید سیاسی قوتوں سے متعلق افراد کے معاملات کو بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یعنی سابق صدر جناب آصف علی زرداری اور پیپلز پارٹی کے وہ لوگ اور اس کے اتحادی، جو ۱۹۸۸ء کے بعد سے حکومت میں رہے ہیں۔ اس طرح تیسرا سیاسی گروہ صدر پرویز مشرف ان کی حلیف مسلم لیگ کی شریک اقتدار پارٹیاں یا شخصیات ہیں، جو جنرل موصوف کے ساتھ ۲۰۰۲ء سے شریک رہی ہیں۔ اس طرح گذشتہ ۳۰ برس میں جن تین بڑے گروپوں کے ہاتھوں میں حکومت کی زمام کاتھی، ان کا احتساب اسی ترتیب سے اس جوڈیشل کمیشن کو کرنا چاہیے۔ باقی افراد، اداروں، تجارتی اور دوسرے اداروں کا احتساب اسی ماڈل کی روشنی میں مستقل ادارہ احتساب کرے۔ واضح رہے کہ جناب محمد نواز شریف صاحب اور ان کے خاندان کے بارے میں سوالات ۱۹۹۲ء سے اٹھ رہے ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ صوبہ پنجاب کی وزارت اعلیٰ کے دور سے

لے کر اب تک ان کے اثاثہ جات میں جو اضافہ ہوا ہے، اس کی مکمل تفصیل قوم کے سامنے آئے۔ آمدنی کے ذرائع، اس پرنیکس کی ادائیگی، سرمایے کی ملک سے باہر منتقلی، بیرون پاکستان جاہلادوں اور کاروبار کا حصول، ہر چیز سامنے آئی چاہیے۔ ماشاء اللہ، اب ان کے بچے بڑے ہیں، اور اپنے معاملات کے ذمے دار ہیں، لیکن انھوں نے اپنے کاروبار کا آغاز تو محمد نواز شریف صاحب ہی کے عطا کردہ وسائل سے کیا تھا۔ اس سے متعلق امور سامنے آنے چاہئیں۔

اسی طرح جناب آصف علی زرداری اور ان کی اہلیہ مرحومہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے مالی معاملات، شادی کے وقت ان کے مالی وسائل اور اس کے بعد سے اب تک اس خانوادے نے خود یا اپنے نمائندوں (proxies) کے ذریعے جو کچھ حاصل کیا، اس کی تفصیل اور دلیل و جواز (justifications) قوم کے سامنے آنے ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں جو بھی دستاویزات ملک کے اداروں یا عالمی اداروں اور میڈیا کے پاس ہیں، ان سب کی روشنی میں حالات اور معاملات کی پوری تصویر قوم کے سامنے پیش کی جانی از بس ضروری ہے۔

ہم نے مارچ ۲۰۱۶ء کے اشارات اور دوسرے متعدد اہل قلم نے اپنے مضامین اور کالموں میں ان اسکینڈلوں کا ذکر کیا ہے، جو گارڈین، بی بی سی، برطانوی اور سوکس عدالتوں کے فیصلوں میں ضبط تحریر آچکے ہیں۔ جن کا خلاصہ ریمنڈ ڈیلیویک نے اپنی کتاب *Capitalism's Achilles Heel* (مطبوعہ ۲۰۰۵ء) میں پیش کیا ہے، اور جس میں زرداری صاحب کے خاندان کے علاوہ، بلا واسطہ یا بالواسطہ آف شور کمپنیوں اور درجنوں بینک اکاؤنٹس کی تفصیل دی گئی ہے (ملاحظہ ہو: ص ۷۷ تا ۸۲)۔ اس کے علاوہ ٹرانسپیرینسی انٹرنیشنل کی بڑی اہم رپورٹ ۲۰۰۵ء میں، لندن سے شائع ہوئی تھی، جس کے صفحہ ۱۰۲ سے ۱۰۴ تک، گرافکس کی شکل میں تفصیلات پیش کی گئی ہیں، انھیں بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔

یہی معاملہ جنرل پرویز مشرف اور ان کے شرکاء اقتدار گروہ کا ہے۔ انھوں نے ۱۹۹۹ء میں اقتدار میں آنے کے بعد اپنے اثاثوں کا اعلان کیا تھا۔ آج جو کچھ ان کے پاس ہے، اس کے بارے میں اب خاصی معلومات مغربی میڈیا اور خود پاکستانی میڈیا میں برابر آرہی ہیں۔ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ اسلام آباد، کراچی، دہلی، لندن اور نیویارک میں ان کے پاس اربوں روپے کی

جایدادیں ہیں۔ کروڑوں ڈالر، درجنوں بنک اکاؤنٹس میں موجود ہیں۔ ان کو بھی اپنے تمام اثاثوں اور ان کے حصول کی تفصیلات کا حساب دینا ہوگا۔ اور یہی معاملہ اس دور میں ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے، جو ان کے شریک اقتدار رہے ہیں۔ اندرون خانہ کیا کیا کچھ ہوتا رہا ہے، اس کی کچھ جھلکیاں، جنرل مشرف کے ساتھی لیفٹیننٹ جنرل شاہد عزیز کی کتاب یہ خاموشی کہاں تک؟ میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسی طرح ایم کیو ایم کی قیادت کے بارے میں جو معلومات سامنے آ رہی ہیں، وہ بھی اسی دور کا قصہ ہیں۔

اسی لیے ہم سمجھتے ہیں کہ کم از کم ان تین بڑے بڑے ٹولوں (شریف خاندان، زرداری خاندان، مشرف اور ان کے رفقاءے کار) کے مالی معاملات کا پورا پورا حساب کتاب ہونا چاہیے۔ اگر وہ اپنی پاک دامنی ثابت کر دیں تو سر آنکھوں پر۔ لیکن اس کے برعکس، جس جس کا دامن داغ دار ہے، اس کا احتساب شفاف انداز میں ہونا چاہیے، تاکہ کالے دھن کے اس کاروبار پر کہیں تو ضرب لگے اور کسی مقام پر تو اس کو روکا جاسکے، تاکہ اس تاریک باب کو کہیں ختم کیا جاسکے اور شفاف قومی زندگی کے نئے باب کا آغاز ہو سکے۔^۱

جوڈیشل کمیشن کی شرائط تحقیقات (ToRs) میڈیا میں اور سرکوں پر طے نہیں ہو سکتے، بلکہ حکومت اور اپوزیشن سر جوڑ کر بیٹھیں اور طے کر لیں۔ ماضی میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور یہی ہے وہ طریقہ جس سے سیاسی مسائل طے ہوتے ہیں۔

۲۔ ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ ۱۳ اپریل ۲۰۱۶ء کے بعد سے حکومت پاکستان کے نمائندوں اور اپوزیشن کے ترجمانوں کے درمیان جس زبان میں، جس انداز میں، اور جن پلیٹ فارموں پر لفظی جنگ جاری ہے، اسے ختم کرنا از حد ضروری ہے۔ اصولی بات کہنے کا موقع ہمیشہ رہتا ہے،

۱۔ ۱۳ اپریل کو پاناما دستاویزات کی اشاعت کے بعد پاکستان کے میڈیا میں جو چیزیں شائع ہوئی ہیں، ان کو ابتدائی تفتیش کے لیے نقطہ آغاز بنایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں روزنامہ The News ۱۶ اپریل ۲۰۱۶ء میں جنرل پرویز مشرف کے بارے میں فخر درانی کی رپورٹ، پھر اسی اخبار (۱۲ اپریل ۲۰۱۶ء) میں احمد نورانی کی رپورٹ۔ اسی طرح ڈان (۲۲ اپریل) میں افتخار خان اور کلب علی کی رپورٹ، وغیرہ ایسی معلومات فراہم کرتی ہیں، جس سے بہت کچھ مدد حاصل ہو سکتی ہے۔

لیکن جتنے شخصی انداز میں اور جس زبان اور لہجے میں بات ہو رہی ہے، اسے کسی مہذب معاشرے، چہ جائیکہ ایک مسلمان معاشرے میں مناسب، جائز اور معتبر قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس لیے ہماری درخواست ہے کہ سب اپنے اپنے رویے پر نظر ثانی کریں۔ شرائطِ تحقیقات طے کر کے معاملہ عدالتی کمیشن کے سپرد کر دیں اور عدالتی کمیشن بھی اپنے لیے خود ضابطہ کار طے کر لے، تاکہ ایک طرف اصل مسائل اور معاملات سے انصاف کیا جاسکے اور دوسری طرف کمرہ عدالت سیاسی مجاذرائی کا ذریعہ نہ بن جائے، بلکہ گرمی گفتار کو قابو کر کے ساری توجہ حقیقی تفتیش، تحقیق اور حقائق کے تعین پر مرکوز ہونی چاہیے۔

۵- ہم پورے ادب اور دل سوزی سے میڈیا سے بھی درخواست کریں گے کہ اپنے رویے پر غور کرے۔ حقائق کی تلاش اور مختلف نقطہ ہائے نظر کی عکاسی ان کی ذمہ داری ہے، مگر خود فریق بن جانا اور جلتی پر تیل ڈالنا، ہر چیز کو تماشانا کبھی بھی صحت مند صحافت کی روایت نہیں رہی اور نہ ایسا ہونا چاہیے۔ ہم سنسرشپ کے حامی نہیں، لیکن خود اختیاری سنسرشپ، احساس ذمہ داری کی ایک بہتر مثال ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے زیادہ معتبر اور باوقار انداز سے بحث و گفتگو کو صحیح دائرے میں رکھا جاسکتا ہے اور اصل مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے، جس سے ملک کو کالے دھن اور اقتدار اور اختیار کے غلط استعمال کی لعنتوں سے پاک کیا جاسکتا ہے۔

۶- ملک اس وقت بہت ہی نازک حالات سے گزر رہا ہے۔ دہشت گردی اور امن وامان کے مسائل، قومی سلامتی کو چیلنج، افغانستان اور بھارت کا رویہ، امریکا کے بدلتے ہوئے تیور، شرق وسط کا خلفشار، یہ وہ شعلہ فشاں پہلو ہیں جو ہمارے لیے آزمائش کا سامان بنے ہوئے ہیں۔ علاقائی اور عالمی تناظر میں تیزی سے تبدیلیاں آرہی ہیں۔ ان حالات میں ملک کے تمام اداروں اور مؤثر قوتوں کے درمیان تعاون اور مشاورت سے معاملات کو طے کرنے اور قومی مفادات کا تحفظ کرنے کی ضرورت ہے۔ سول، ملٹری تعلقات کا مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے، جسے نظر انداز کیا جاسکے اور نہ اسے قالین کے نیچے دبا کر رکھا جاسکتا ہے۔

کچھ عناصر تصادم کی فضا بنانے پر تلے نظر آتے ہیں۔ اس صورت حال کو ختم کرنا (diffuse) از بس ضروری ہے۔ ہمیں دُکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ اس سلسلے کو بڑھانے میں حکومت وقت کی

خراب حکمرانی ہی واحد سبب نہیں ہے، بلکہ ملک اور بیرون ملک بہت سے عناصر اس آگ کو بھڑکانے میں کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب حکومت اور پارلیمنٹ اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور میڈیا بھی ان حدود کا پورا پورا لحاظ رکھے، جو ایسے نازک معاملات کو سلجھانے اور بروے کار لانے کے لیے ضروری ہیں۔

دستور کے تحت کابینہ کی 'دفاع و سلامتی کی کمیٹی' وہ اہم فورم ہے، جسے اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے۔ اس کی نشست کافی الحال باقاعدگی سے ہر مہینے اہتمام کیا جائے، جسے بعد میں حالات کی مناسبت سے معمول بنالیا جائے۔ اسی طرح کابینہ کا اجلاس ہر ماہ لازماً ہونا چاہیے۔ وفاقی کابینہ اور 'مشترکہ مفادات کی کونسل' (CCI) وہ ادارے ہیں، جن کو باقاعدگی سے اپنے اداراتی فرائض انجام دینے چاہئیں۔ پارلیمانی حکومت نام ہی کینٹ گورنمنٹ کا ہے، ورنہ یہ ایک قسم کا صدقاتی نظام بن جاتا ہے۔ یہ ہمارے دستور اور ہمارے زمینی حقائق دونوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا اور بد قسمتی سے ہم اس طرف لڑھکتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے فوری تدارک کی ضرورت ہے۔

۷۔ حکومت اور اپوزیشن دونوں اسمبلی اور سینیٹ کو قرارِ واقعی اہمیت دیں اور ریاست کے تمام اداروں کو ان کی دستور کی طے کردہ حدود کار اور آج کے زمینی حقائق دونوں کی روشنی میں خوش اسلوبی کے ساتھ اصل توازن کی طرف لے جانے کی کوشش کریں۔

دستور ایک معاہدہٴ عمرانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دستور کے فریم ورک میں سارے سیاسی مسائل اور اختلافات کو حل کیا جانا چاہیے۔ دستور کے دائرے سے نکل کر جو بھی حل ہوگا، وہ حل نہیں، بلکہ نئے مسائل اور مشکلات کا پیش خیمہ بن جائے گا، اور خدا نخواستہ ملک ایسے خلفشار کا بھی نشانہ بن سکتا ہے جو اس کے لیے تباہی کا باعث ہو۔ توقع ہے کہ اس اشارے کو سبھی سیاسی عناصر اور قوتیں محسوس کریں گی، اور دستور سے کھیل کھیلنے کا کسی کو موقع نہیں دیں گی۔

۸۔ لوکل گورنمنٹ کو جلد از جلد قائم کرنا وقت کی ضرورت ہے۔ انہیں اختیارات اور وسائل دونوں دیں۔ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے ارکان کی ساری توجہ کا مرکز وفاق اور اپنے اپنے صوبے کے مسائل پر ہونی چاہیے اور اس سلسلے میں قانون سازی، پالیسی سازی، حکومت کی کارکردگی پر نگرانی، عوامی مسائل پر توجہ اور حکومت اور عوام کے درمیان پل کا کردار ادا کرنا چاہیے۔ ترقیاتی کاموں ہی

میں ان کو گھسیٹنا اور پھر ترقیاتی فنڈ ان کے توسط سے خرچ کرنا بڑے خسارے کا سودا ہے، جو بد قسمتی سے وزیر اعظم محمد خاں جو نیچو صاحب (۸۸-۱۹۸۵ء) کے دور سے شروع ہوا اور کرپشن کے فروغ اور اچھی حکمرانی کے پڑی سے اترنے کا سبب بنا ہے۔ اس کچھ کو ختم ہونا چاہیے۔ جو کام لوکل گورنمنٹ کا ہے، وہ لوکل گورنمنٹ کرے اور جو کام صوبے اور مرکز کے اداروں کا ہے، وہ انھیں انجام دیں۔ ترقیاتی کام کے سلسلے میں مرکزی پلاننگ کمیشن اور ہر صوبے میں موثر پلاننگ کمیشن ضروری ہیں۔ اسی طرح پولیس اور انتظامیہ کو سیاسی شکنجے سے نکالنا بھی از بس ضروری ہے۔ فوج اور رینجرز سے معاملہ کاری (equation) پر بھی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ عدالت کی اپنی اصلاح، تقویت، تربیت اور احتساب، یہ سب ضروری ہیں۔

۹۔ یہاں ہم دو مسئلوں کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں: ایک معاشرے کا اخلاقی بگاڑ، جس کے نتیجے میں باہمی حقوق کے احترام کا فقدان ہے۔ رواداری اور خوش خلقی سے معاشرہ محروم ہوتا جا رہا ہے۔ جرائم اور جنسی جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے اور بحیثیت مجموعی معاشرے میں تشدد کا رجحان بڑھ رہا ہے، جو خطرے کی علامت ہے۔ الحمد للہ، آج بھی ہمارے معاشرے میں جو نیر ہے، وہ اللہ کی نعمت ہے اور اس پر جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ لیکن یہ فکر مندی بھی ضروری ہے کہ معاشرے کی اقدار کمزور ہو رہی ہیں اور اخلاقی بگاڑ میں اضافہ ہو رہا ہے، جس کی سب کو فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر فرد، خاندان، معاشرہ، دینی اور سیاسی قوتیں، سول سوسائٹی، حکومت اور اس کے تمام ادارے۔۔۔ اس باب میں ہر ایک کو متحرک ہونا پڑے گا۔ کرپشن پر گرفت کے لیے احتساب کا موثر نظام ضروری ہے، مگر کرپشن کو ختم کرنے کے لیے فرد اور معاشرے کی اخلاقی تعمیر و اصلاح اور ان اسباب کا پُچن چُن کر قلع قمع کرنا ضروری ہے، جو اسے جنم دے رہے ہیں اور پروان چڑھا رہے ہیں۔ آنکھیں بند کرنے سے معاملات حل نہیں ہو سکتے، مسائل کو کھلی آنکھوں دیکھ سمجھ کر ہی قابو میں لایا جاسکتا ہے۔

۱۰۔ آخر میں عرض یہ ہے کہ ہمیں ملک کو نظریاتی اور فکری انتشار سے بچانا ہے۔ ہماری آبادی کا ۹۰ فی صد اپنے دین اور نظریے، اپنے ملی اور قومی تشخص، اپنی اخلاقی اور تہذیبی اساس اور اپنی نئی نسلوں کی منزل کے بارے میں کسی شک کا شکار نہیں ہے۔ فقط، ایک طبقہ ہے جو کبھی لبرل ازم کا، کبھی سیکولرزم کا راگ الاپتا ہے۔ کبھی دہشت گردی کو جہاد کا شاخسانہ قرار دے کر، کبھی اپنی تاریخ پر

خطِ تَنْبِيْخِ پھیرنے، اور کبھی قوم اور خصوصیت سے نئی نسلوں میں ذہنی پراگندگی اور خلفشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں انگریزی صحافت اور الیکٹرانک میڈیا کا رویہ خاصا پریشان کن بلکہ وطن دشمنانہ ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان سب عناصر سے بھی مکالمے کا راستہ اختیار کیا جائے۔ ان حضرات کو جہاں اپنے نظریات پر قائم رہنے کا حق ہے، وہیں انھیں بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ پاکستان کی شناخت اور مسلم معاشرے کی بنیادی اقدار کوئی بحث طلب شے نہیں ہیں۔ اپنے اور غیروں کے کیے ہوئے تمام جائزے (سرورے) شاہد ہیں کہ ۹۰ فی صد آبادی شریعت کی بالادستی اور اسلامی اقدار و احکام کی پاس داری کی خواہاں ہے۔ یہ جذبہ شہری اور دیہی آبادی میں، مردوں اور عورتوں میں، عمر رسیدہ افراد اور نوجوان آبادی میں ایک ہی طرز (pattern) پر ہے۔ یہ زمینی حقائق ہیں، جن کا احترام ہی قوم اور معاشرے میں ہم آہنگی اور تعمیری قوتوں کی تقویت کا باعث ہو سکتا ہے۔

جس قوم میں تعداد میں کم، مگر وسائل میں مضبوط بااثر، صاحبِ ثروت طبقوں اور عوام الناس کے درمیان نظریاتی اور تہذیبی کش مکش برپا رہے، وہ قوم کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ اختلافِ رائے کا احترام مہذب معاشرے کی شناخت ہے۔ تاہم، یہ بھی مہذب معاشرے ہی کی ایک ضرورت ہے کہ بااثر افراد، اکثریت کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھیں اور تبدیلی کا راستہ افہام و تفہیم اور تعلیم و تعلم اور اختلاف اور احترام کے ذریعے استوار کریں۔ اگر ایک مخصوص اقلیت محض اپنے وسائل اور بالاتر پوزیشن کے زعم میں اپنے خیالات اور ترجیحات دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرے گی تو یہ تصادم اور تباہی کا راستہ ہوگا۔

ہم ان افراد کو بھی جو مذہبی تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں، یہی مشورہ دیں گے جو لبرل، تشدد پسندوں کو دے رہے ہیں کہ مستقبل کی روشن راہ صرف اعتدال اور توازن میں ہے۔ اپنے مسلک پر قائم رہیے، لیکن دوسرے کے مسلک کی تحقیر نہ کیجیے۔ رواداری اور مکالمہ ہی وہ راستہ ہے، جس سے قومیں ترقی کرتی ہیں۔ زندگی اور عزت سے زندہ رہنے کا یہی راستہ ہے، جس پر ہمیں ہمت اور استقلال سے سرگرم کار رہنا چاہیے۔ (کتابچہ دستیاب ہے۔ منشورات)

آئیے مہنگانہ کی برکتیں سمیٹنے کی تیاری کریں

خود پڑھیں، دوسروں کو پڑھائیں

روزے کا اصل مقصد
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

روزہ
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

رمضان ماہ تربیت
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

روزہ اور ضبط نفس
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

آداب رمضان
مولانا محمد یوسف اصلاحی

کوئی نئی کتاب آئی ہے؟

جی ہاں!

پہلی بار کتابی شکل میں

دروس قرآن

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تدوین

حفیظ الرحمن احسن

قیمت: 280/- روپے

صفحات: 304

اسلامک پبلی کیشنز منصورہ ملتان روڈ لاہور

Ph: 042-35252501-2, Mob: 0322-4673731 Email: islamicpak@gmail.com